قرآن خدا کی کتاب

مولانا وحید الدین خان

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دعویٰ کیا کہ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے اتری ہے تو بہت سے لوگوں نے اس کو نہیں مانا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ایک انسانی تصنیف ہے نہ کہ خدائی تصنیف۔ اس کے جواب میں قرآن میں کہا گیا کہ اگر تم اپنے قول میں سچے ہو تو قرآن کے مانند ایک کلام بنا کر لاؤ (اَمْ یَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ بَلْ لَّا یُؤْمِنُوْنَ۔ فَلْیَاْتُوْا بِحَدِیْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِیْنَ، الطور ۳۴)

اسی کے ساتھ قرآن نے مطلق لفظوں میں یہ اعلان کر دیا کہ اگر تمام انسان اور جن اس بات پر اکٹھا ہو جائیں کہ وہ قرآن جیسی کتاب لے آئیں تو وہ ہرگز نہ لا سکیں گے، چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہو جائیں (قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا، الاسراء ۸۸) قرآن ایک ابدی کتاب ہے، اس لحاظ سے یہ ایک ابدی چیلنج ہے۔ قیامت تک کے انسان تمام اس کے مخاطب ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ قرآن کی وہ کون سی خصوصیت ہے جو انسان کے لیے ناقابل تقلید ہے۔ اس کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کریں گے جو قرآن میں ان لفظوں میں بیان ہوا ہے:

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِیْهِ اخْتِلَافًا كَثِیْرًا (النساء ۸۲)	کیا لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے۔ اور اگر وہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف پاتے۔

اس آیت میں "اختلاف" کی تفسیر تفاوت، تعارض، تناقض، تضاد وغیرہ الفاظ سے کی گئی ہے۔ آرتھر آربری نے اختلاف کا ترجمہ نامطابقت (Inconsistency) کیا ہے۔

© rasailojaraid.com

کلام میں تناقض نہ ہونا ایک انتہائی نادر صفت ہے جو صرف خدائے ذوالجلال کے یہاں پائی جاسکتی ہے۔ کسی انسان کے لیے ایسا کلام تخلیق کرنا ممکن نہیں۔ تناقض سے پاک کلام وجود میں لانے کے لیے ضروری ہے کہ صاحبِ کلام کا علم ماضی سے مستقبل تک کے امور کا احاطہ کیے ہوئے ہو۔ وہ تمام موجودات کا کلی علم رکھتا ہو۔ وہ چیزوں کی اصل ماہیت سے بلا اشتباہ پوری طرح باخبر ہو۔ اس کا علم براہِ راست واقفیت پر مبنی ہو نہ کہ بالواسطہ معلومات پر۔ اسی کے ساتھ اس کے اندر یہ انوکھی خصوصیت ہو کہ وہ اشیاء کو غیر متاثر ذہن سے ٹھیک ویسا ہی دیکھ سکتا ہو جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں۔

یہ تمام غیر معمولی اوصاف صرف خدا میں ہو سکتے ہیں۔ کوئی انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ خدا کا کلام ہر تضاد اور تناقض سے پاک ہوتا ہے۔ انسان کبھی ان اوصاف کا حامل نہیں ہو سکتا، اس لیے انسان کا کلام کبھی تضاد اور تناقض سے پاک نہیں ہوتا۔

© rasailojaraid.c

خدائی خاصہ

کلام میں تضاد کا معاملہ کوئی اتفاقی معاملہ نہیں، یہ انسانی فکر کا لازمی خاصہ ہے۔ یہ دنیا اس طرح بنی ہے کہ وہ صرف خدائی فکر کو قبول کرتی ہے۔ اس دنیا میں یہ ناممکن ہے کہ خدا کو چھوڑ کر کوئی متوافق نظریہ بنایا جا سکے۔ خدا کے سوا دوسری بنیاد پر جو نظریہ بھی بنایا جائے گا وہ فوراً تضاد کا شکار ہو جائے گا۔ وہ کائنات کے مجموعی ڈھانچہ سے ہم آہنگ نہیں ہو سکتا۔

اس دنیا میں کسی انسانی نظریہ کے لیے ممکن نہیں کہ وہ فکری تضاد سے خالی ہو سکے۔ اس بات کو ہم یہاں مثال کے ذریعہ واضح کریں گے۔

نظریہ ارتقاء

اس کی ایک مثال حیاتی ارتقاء کا نظریہ ہے۔ ڈارون (۱۸۸۲ - ۱۸۰۹) اور دوسرے سائنس دانوں نے دیکھا کہ زمین پر جو مختلف انواع حیات موجود ہیں ان میں ظاہری اختلافات کے باوجود حیاتیاتی نظام کے اعتبار سے کافی مشابہت پائی جاتی ہے۔ مثلاً گھوڑے کا ڈھانچہ اگر کھڑا کیا جائے تو وہ انسان کے ڈھانچہ سے ملتا جلتا نظر آئے گا۔

اس قسم کے مختلف مشاہدات سے انہوں نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ انسان کوئی علحدہ نوع نہیں۔

© rasailojaraid.c

انسان اور حیوان دونوں ایک ہی مشترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں ۔ رینگنے والے جانور اور چوپائے اور بندر سب حیاتیات کے سفر ارتقاء کی پچھلی کڑیاں ہیں ۔ اور انسان اس سفرِ ارتقاء کی اگلی کڑی ہے ۔

یہ نظریہ ایک سو سال تک انسانی ذہن پر حکمران رہا ۔ مگر بعد کو مزید مطالعہ نے بتایا کہ وہ کائنات کے مجموعی نظام سے ٹکرا رہا ہے ، وہ اس کے اندر درست نہیں بیٹھتا ۔

مثال کے طور پر سائنسی طریقوں کے استعمال سے اب یہ معلوم ہو گیا ہے کہ زمین کی عمر کیا ہے ۔ چنانچہ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً دو ہزار ملین سال پہلے زمین وجود میں آئی ۔ یہ مدت ڈارون کے مفروضہ ارتقاء کو ظہور میں لانے کے لیے انتہائی حد تک ناکافی ہے ۔ سائنس دانوں نے حساب لگا کر اندازہ کیا ہے کہ صرف ایک پروٹینی سالمہ کے مرکب کو ارتقائی طور پر وجود میں لانے کے لیے سنکھ ہا سنکھ ملین سال سے بھی زیادہ مدت درکار ہے ۔ پھر صرف دو ہزار ملین سال میں زمین کی سطح پر مکمل اجسام رکھنے والے حیوانات کی دس لاکھ سے زیادہ قسمیں کیسے بن گئیں اور نباتات کی دو لاکھ سے زیادہ تکمیل یافتہ قسمیں کیوں کر وجود میں آگئیں ۔ اس قلیل مدت میں تو ایک معمولی حیوان بھی نہیں بن سکتا ۔ کجا کہ مفروضہ ارتقاء کے مطابق لاتعداد مراحل سے گزر کر انسان ظہور میں آجاتا ۔

نظریہ ارتقاء حیاتیاتی عمل میں جن نوعی تبدیلیوں کو فرض کرتا ہے ان کے متعلق ریاضیات کے ایک عالم پاٹو (Patau) نے حساب لگایا ہے ۔ اس کے مطابق کسی نوع میں ایک چھوٹی سی تبدیلی کو مکمل ہونے کے لیے دس لاکھ پشتوں کی مدت درکار ہے ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اگر مفروضہ ارتقائی عمل کے ذریعہ کتے جیسی نسل میں ان گنت تبدیلیوں کے جمع ہونے سے گھوڑے جیسا بالکل مختلف جانور بنے تو ان کے بننے میں کس قدر زیادہ لمبا عرصہ درکار ہو گا ۔

اس مشکل کو حل کرنے کے لیے وہ نظریہ وضع کیا گیا جس کو پین سپرمیا (Panspermia) کا نظریہ کہا جاتا ہے ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ زندگی ابتداءً زمین کے باہر بالائی خلا میں کسی مقام پر پیدا ہوئی اور وہاں سے سفر کر کے زمین پر آئی ۔ مگر تحقیق نے بتایا کہ اس کو ماننے میں اور بھی زیادہ بڑی بڑی مشکلیں حائل ہیں ۔ زمین کے علاوہ وسیع کائنات کے کسی بھی ستارہ یا سیارہ پر وہ اسباب موجود نہیں ہیں جہاں زندگی جیسی چیز نشو ونما پا سکے ۔ مثلاً پانی جو زندگی کے ظہور اور بقا کے لیے لازمی طور پر ضروری ہے وہ اب تک کی معلومات کے مطابق زمین کے سوا کہیں اور موجود نہیں ۔

پھر کچھ ذہین افراد نے فجائی ارتقاء (Emergent Evolution) کا نظریہ وضع کیا ۔ اس کے مطابق فرض کیا گیا کہ زندگی یا اس کی انواع بالکل اچانک پیدا ہو جاتی ہیں ۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ محض ایک

© rasailojaraid.com

مفروضہ ہے نہ کوئی علمی نظریہ۔ اچانک پیدائش کبھی اندھے مادی قوانین کے ذریعے ممکن نہیں۔ اچانک پیدائش کا نظریہ لازمی طور پر ایک مداخلت کرنے والے کا تقاضا کرتا ہے۔ یعنی اسی خارجی عامل کا جس کو نہ ماننے کے لیے یہ تمام نظریات گھڑے گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی توجیہہ ایک خالق کو مانے بغیر ممکن ہی نہیں۔ خالق کو چھوڑ کر دوسری جو بنیاد بھی تلاش کی جائے گی وہ کائنات کے نقشہ سے ٹکرا جائے گی، وہ اس کے ڈھانچے میں جگہ نہیں پا سکتی۔

انسان کی لاعلمی

لندن سے ایک کتاب چھپی ہے جس کا نام ہے قاموس جہالت، اس قاموس کی ترتیب [میں] مختلف شعبوں کے ممتاز اہل علم نے حصہ لیا ہے۔ اس کے تعارف نامہ میں بتایا گیا ہے کہ قاموس جہالت [میں] ساٹھ نہایت معروف سائنس والوں نے مختلف تحقیقی شعبوں کا جائزہ لے کر دکھایا ہے کہ دنیا کے متعلق [ہم]ارے علم میں کون سے بامعنیٰ خلا پائے جاتے ہیں:

In the Encylopaedia of Ignorance some 60 well-known scientists survey different fields of research, trying to point out significant gaps in our knowledge of the world.

یہ کتاب درحقیقت اس واقعہ کا علمی اعتراف ہے کہ دنیا کو بنانے والے نے اس کو اس طرح [بن]ایا ہے کہ وہ کسی بھی میکانیکل توجیہہ کو قبول نہیں کرتی۔ مثال کے طور پر پروفیسر جان بنارڈ سمتھ نے [اپ]نے مقالہ میں لکھا ہے کہ نظریہ ارتقاء ناقابل حل اندرونی مسائل (Built-in Problems) سے [دو]چار ہے۔ کیونکہ ہمارے پاس نظریات ہیں۔ مگر ہمارے پاس وہ ذرائع نہیں کہ ہم حقیقی واقعات سے اپنے [نظ]ریات کی تصدیق کر سکیں۔

قرآن کے مطابق انسان اور دوسری تمام انواع خدا کی تخلیق ہیں۔ اس کے برعکس نظریہ ارتقاء زندگی کی [تما]م قسموں کو اندھے مادی عمل کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ قرآن کا جواب اپنی توجیہہ آپ ہے۔ کیونکہ خدا ایک [صا]حب ارادہ ہستی ہے۔ وہ اسباب کا محتاج نہیں۔ وہ اپنی مرضی کے تحت کسی بھی واقعہ کو ظہور میں لا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ارتقائی عمل کے لیے ضروری ہے کہ ہر واقعہ کے پیچھے اس کا کوئی سبب پایا جائے۔ [مگ]ر ایسے اسباب کی دریافت ممکن نہیں اس لیے نظریہ ارتقاء اس دنیا میں بے توجیہہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ ارتقاء کا نظریہ لازمی منطقی خلا سے دوچار ہے۔ جبکہ قرآن کے نظریہ میں کوئی منطقی خلا نہیں پایا جاتا۔

© rasailojaraid.com

علم سیاست

یہی معاملہ فلسفہ سیاسیات کا ہے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مقالہ نگار کے الفاظ میں، سیاسی فلسفہ اور سیاسی اختلافات بنیادی طور پر ایک ہی سوال کے گرد گھومتے ہیں۔ یہ کہ کس کو کس کے اوپر اقتدار حاصل ہو:

Political Philosophy and political conflict have revolved basically around who should have power over whom. (14/697)

اس میدان فکر میں پچھلے پانچ ہزار سال سے اعلیٰ ترین انسانی دماغ اپنی کوششیں صرف کر رہے ہیں۔ اس کے باوجود علم سیاسیات کا مربوط نظام بنانے کے لیے وہ چیز دریافت نہ ہو سکی جس کو اس علمی بنیاد (Scientific Base) کہا ہے۔

علم سیاسیات میں ایک درجن سے زیادہ مدارس فکر پائے جاتے ہیں۔ تاہم وسیع تر تقسیم میں صرف دو ہیں۔ ایک وہ جو شخصی اقتدار کی وکالت کرتے ہیں۔ دوسرے وہ جو جمہوری اقتدار کے حامی ان دونوں ہی پر سخت ترین اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ شخصی اقتدار کے نظریہ پر یہ اعتراض واقع ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے اوپر کیوں حاکمانہ اقتدار حاصل ہو۔ چنانچہ وہ کبھی قبولیت حاصل نہ کر سکا۔ دوسرا نظریہ وہ ہے جس کو جمہوری اقتدار کا نظریہ کہا جاتا ہے۔ عملاً اگرچہ یہ ایک مقبول ہے مگر نظری اور فکری اعتبار سے اس پر سخت ترین شبہات کا اظہار کیا گیا ہے۔

جمہوریت (ڈیموکریسی) کا نظریہ اسی عقیدہ پر قائم ہے کہ تمام انسان آزاد ہیں اور برابر کے حقوق رکھتے ہیں۔ روسو کی کتاب معاہدۂ عمرانی (Social Contract) کا پہلا فقرہ یہ ہے:

انسان آزاد پیدا ہوا ہے۔ مگر میں اس کو زنجیروں میں جکڑا ہوا دیکھتا ہوں۔

ڈیموکریسی ایک یونانی لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں حکومت بذریعہ عوام (Rule by the People) مگر عملاً یہ ناممکن ہے کہ تمام عوام کی حکومت قائم ہو سکے۔ سارے لوگوں پر سارے لوگ آخر کس طرح حکومت کریں گے۔ مزید یہ کہ انسان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سماجی حیوان (Social Animal) ہے۔ انسان اس دنیا میں اکیلا نہیں ہے کہ وہ جس طرح چاہے رہے۔ بلکہ وہ سماجی مجموعہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ایک مفکر کے الفاظ میں۔ انسان آزاد نہیں پیدا ہوا۔ انسان ایک سماج کے اندر پیدا ہوا ہے جو کہ اس کے اوپر پابندیاں عائد کرتا ہے:

Man is not born free. Man is born into society, which imposes

© rasailojaraid.com

restraints on him.

جب سارے عوام بیک وقت حکومت نہیں کر سکتے تو عوامی حکومت کا نظام کس طرح بنایا جائے۔ اس سلسلہ میں مختلف نظریے پیش کیے گئے۔ سب سے زیادہ مقبول نظریہ روسو کا نظریہ ہے جس کو اس نے رائے عامہ (General Will) کی بنیاد پر قائم کیا ہے۔ یہ رائے عامہ حکمران افراد کے انتخاب میں ظاہر ہوتی ہے۔ اس طرح عوام کی حکومت عملاً منتخب افراد کی حکومت بن جاتی ہے۔ عوام کو انتخاب میں ووٹ دینے کی کس قدر آزادی ہوتی ہے۔ مگر ووٹ دینے کے بعد وہ دوبارہ اپنے جیسے کچھ افراد کے محکوم بن جاتے ہیں۔ روسو نے اس کا جواب یہ دیا کہ ایک شخص کی خواہش کی پیروی غلامی ہے مگر خود اپنے مقرر کردہ قانون کی پیروی کرنا آزادی ہے:

To follow one's impulse is slavery but to obey the self-prescribed law is liberty. (15/1172)

© rasailojaraid.com

ظاہر ہے کہ یہ جواب ناکافی تھا۔ چنانچہ اس نظریہ کو دوبارہ سخت اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔ کیوں کہ لوگ دیکھ رہے تھے کہ خوبصورت الفاظ کے باوجود منتخب جمہوریت عملاً منتخب بادشاہت (Elective Monarchy) کا دوسرا نام ہے۔ انتخاب کے بعد جمہوری افراد وہی کچھ بن جاتے ہیں جو اس سے پہلے شاہی افراد بنے ہوئے تھے۔

اس طرح تمام سیاسی مفکرین تضاد فکری کا شکار ہیں جس سے نکلنے کا کوئی راستہ انہیں نظر نہیں آتا۔ اعتقادی طور پر سب کے سب مساوات انسانی کو اعلیٰ ترین قدر مانتے ہیں۔ مگر انسانی مساوات حقیقی معنوں میں نہ شاہی نظام میں حاصل ہوتی اور نہ جمہوری نظام میں۔ شاہی نظام اگر خاندانی بادشاہت ہے تو جمہوری نظام انتخابی بادشاہت۔ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں شاہی نظام کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی۔ مگر جب شاہی افراد کی محکومی ختم ہوگئی تو لوگوں کو معلوم ہوا کہ ان کے لیے دوسرا بدل صرف یہ ہے کہ نمائندہ افراد کی محکومی پر اپنے آپ کو راضی کر لیں۔ دونوں نظاموں میں جو فرق تھا وہ صرف یہ کہ نئے حکمران اپنے کو زمین پر عوام کا نمائندہ کہتے تھے۔ جبکہ پرانے حکمرانوں کا کہنا تھا کہ وہ زمین پر خدا کے نمائندے (Representative of God on Earth) ہیں۔

برٹانیکا کے مقالہ نگار نے اس معاملہ میں انسان کی ناکامی کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

The History of Political Philosophy from Plato until the present day makes plain that Modern Political Philosophy is still faced with the basic problems. (14/695)

© rasailojaraid.com

سیاسی فلسفہ کی تاریخ ، افلاطون سے لیکر اب تک ، ظاہر کرتی ہے کہ جدید سیاسی فلسفہ ابھی تک بنیادی مسائل سے دوچار ہے ۔

بادشاہت یا جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کا حق انسانوں میں سے کچھ انسان کو دینا پڑتا ہے۔ اس طرح دونوں نظام مساواتِ انسانی کی تردید بن جاتے ہیں۔ جمہوریت عین مساوات انسانی ہی کے نام پر پیش کی گئی ۔ مگر وہ اپنے اندرونی تضاد کی وجہ سے برعکس نتیجہ کی حامل ثابت ہوئی۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک ہی سیاسی فلسفہ ہے جو اس دنیا میں فکری تضاد سے خالی ہوسکتا ہے اور وہ قرآن کا فلسفہ ہے۔ قرآن خدائی حاکمیت کا نظریہ پیش کرتا ہے :

يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۚ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ

وہ کہتے ہیں کہ کیا حکم میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ کہو کہ حکم سب اللہ ہی کا ہے۔ (آل عمران ۱۵۴)

یہ نظریہ فکری تضاد سے پوری طرح خالی ہے ۔ جب خدا حاکم اور تمام لوگ محکوم ہوں تو سارے انسان برابر ہوجاتے ہیں۔ ایک انسان اور دوسرے انسان کا تمام فرق مٹ جاتا ہے ۔ اب فرق صرف خالق اور مخلوق کے درمیان رہتا ہے نہ کہ مخلوق اور مخلوق کے درمیان۔

خدا کی حاکمیت میں تمام انسان برابر کا درجہ پالیتے ہیں۔ کیونکہ اقتدار انسانوں سے باہر ایک بالاتر ہستی میں تفویض کردیا جاتا ہے ۔ اس کے برعکس بادشاہت یا جمہوریت میں مساوات کی قدر باقی نہیں رہتی کیوں کہ ان میں ایک انسان کے مقابلہ میں دوسرے انسان کو صاحب اقتدار ماننا پڑتا ہے۔

خدا کی حاکمیت کا نظریہ ایک مربوط نظام فکر بناتا ہے جو ہر قسم کے تضادات سے خالی ہے۔ جب کہ انسانی حاکمیت کا کوئی نظریہ کبھی ایسا نہیں بنایا جاسکتا جو تضاد اور تناقض سے پاک ہو۔

تمام سیاسی نظریات کی کوشش یہ رہی ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کریں مگر انسانی نظام میں یہ تقسیم کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔ خواہ جو بھی سیاسی نظام بنایا جائے ، یہ صورت ہمیشہ باقی رہے گی کہ کچھ لوگ ایک یا دوسرے نام پر حاکم بن جائیں گے اور بقیہ لوگ محکوم کی حیثیت اختیار کرلیں گے۔ مگر جب خدا کو حاکم مان لیا جائے تو یہ تقسیم اپنے آپ ختم ہوجاتی ہے ۔ اب ایک طرف خدا ہوتا ہے اور دوسری طرف انسان۔ حاکم اور محکوم کی تقسیم صرف خدا اور انسان کے درمیان رہتی ہے۔ باقی جہاں تک انسان اور انسان کے درمیان کا معاملہ ہے ، سب انسان مساوی طور پر یکساں حیثیت کے مالک ہوجاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان حاکم اور محکوم کی تقسیم ختم کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا

© rasailojaraid.c

ام نہیں کہ خدا کو بادشاہِ حقیقی مان کر سب انسان اپنے آپ کو اس کی ماتحتی میں دیدیں۔

تضاد کی دو قسمیں

قرآن کی مذکورہ آیت (النساء ۸۲) میں جس تضاد یا نامطابقت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے
د خاص پہلو ہیں۔ ایک داخلی اور دوسرا خارجی۔

داخلی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا ایک بیان کتاب کے دوسرے بیان سے ٹکرا رہا ہو۔
ارجی غیر مطابقت یہ ہے کہ کتاب کا بیان خارجی دنیا کے حقائق سے ٹکرا جائے۔ قرآن کا دعویٰ ہے
، وہ ان دونوں قسم کے تضادات سے خالی ہے۔ جبکہ کوئی بھی انسانی تصنیف ان سے خالی نہیں
تی۔ یہی واقعہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن غیر انسانی ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے۔ اگر وہ ایک
سانی کلام ہوتا تو یقیناً اس کے اندر بھی وہی کمی پائی جاتی جو تمام انسانی کلام میں غیر استثنائی طور
پائی جاتی ہے۔

داخلی تضاد

کلام میں داخلی تضاد حقیقتاً متکلم کی شخصیت میں داخلی کمی کا نتیجہ ہوتا ہے۔ داخلی تضاد سے
نے کے لیے دو چیزیں لازمی طور پر ضروری ہیں۔ ایک کامل علم اور دوسرے کامل موضوعیت
(Objectivity) کوئی انسان ان دونوں کمیوں سے خالی نہیں ہوتا۔ اس لیے کسی انسان کا کلام
لی تضاد سے پاک بھی نہیں ہوتا۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام کمیوں سے پاک ہے۔ اس لیے صرف خدا
لام ہے جو داخلی تضاد سے پوری طرح خالی ہے۔

انسان اپنی محدودیت کی وجہ سے بہت سی باتوں کو اپنی عقل کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ اس
ے قیاسی طور پر کبھی وہ ایک بات کہتا ہے اور کبھی دوسری بات۔ ہر انسان کا یہ حال ہے کہ وہ ناپختہ
سے پختہ عمر کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ناپختہ عمر میں جو بات کہتا ہے، پختہ عمر
پہنچ کر وہ خود اس کے خلاف بولنے لگتا ہے۔ ہر آدمی کا علم اور تجربہ بڑھتا رہتا ہے اس بنا پر اس کا
ئی کلام کچھ ہوجاتا ہے اور آخری کلام کچھ۔ انسان کی عمر بہت تھوڑی ہے۔ اس کی واقفیت ابھی
سوا نہیں ہوتی کہ اس کی موت آجاتی ہے۔ وہ اپنی نامکمل واقفیت کی بنا پر ایسی بات کہتا ہے جو اس
جلد درست ثابت نہیں ہوتی

اسی طرح آدمی کو کسی سے دوستی ہوتی ہے اور کسی سے دشمنی۔ وہ کسی سے محبت کرتا ہے اور کسی

© rasailojaraid.com

سے نفرت۔ وہ کسی کے بارے میں سادہ ذہن کے تحت سوچتا ہے اور کسی کے بارے میں ردعمل کی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسان پر کبھی غم کا لمحہ گزرتا ہے اور کبھی خوشی کا۔ وہ کبھی ایک ترنگ میں ہوتا ہے اور کبھی دوسری ترنگ میں۔ اس بنا پر انسان کے کلام میں یکسانیت نہیں ہوتی۔ وہ کبھی ایک طرح کی بات کہتا ہے اور کبھی دوسری طرح کی۔

خدا ان تمام کمیوں سے پاک ہے، اس لیے اس کا کلام ہمیشہ یکساں ہوتا ہے اور ہر قسم کے تناقض سے خالی بھی۔

حضرت مسیح کی شخصیت

مثال کے طور پر بائبل کو لیجئے۔ بائبل اپنی ابتدائی حالت میں خدا کا کلام تھی۔ مگر بعد کو اس میں انسانی ملاوٹ ہوئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس میں کثرت سے داخلی تضادات پیدا ہو گئے۔ بائبل کا وہ حصہ جس کو انجیل یا نیا عہد نامہ کہا جاتا ہے۔ اس میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نسب نامہ دیا گیا ہے۔ یہ نسب نامہ متی کی انجیل میں اس طرح شروع ہوتا ہے:

یسوع مسیح ابن داؤد ابن ابراہام کا نسب نامہ

یہ مختصر نسب نامہ ہے۔ اس کے بعد انجیل میں مفصل نسب نامہ ہے جو حضرت ابراہیم سے شروع ہوتا ہے۔ اور آخر میں "یوسف" پر ختم ہوتا ہے جو اس کے بیان کے مطابق مریم کے شوہر تھے جن سے حضرت مسیح پیدا ہوئے۔

اس کے بعد قاری مرقس کی انجیل تک پہنچتا ہے تو وہاں کتاب کے آغاز میں حضرت مسیح کا نسب نامہ ان لفظوں میں ملتا ہے:

یسوع مسیح ابن خدا

گویا انجیل کے ایک باب کے مطابق حضرت مسیح یوسف نامی ایک شخص کے فرزند تھے۔ اور انجیل کے دوسرے باب کے مطابق حضرت مسیح ابن خدا (خدا کے بیٹے) تھے۔

انجیل اپنی ابتدائی صورت میں یقیناً خدائی کلام تھی اور تضادات سے پاک تھی۔ مگر بعد کو اس میں انسانی کلام شامل ہو گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے بیانات میں تضاد پیدا ہو گیا۔

انجیل کے اس تضاد کی تاویل کلیسا نے ایک اور عجیب و غریب تضاد سے کی ہے۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) کے مطابق وہ مذکورہ یوسف کے لیے حسب ذیل الفاظ استعمال کرتے ہیں:

Christ's Earthly Father, The Virgin Mary's Husband

© rasailojaraid.com

مسیح کا ارضی باپ، کنواری مریم کا شوہر۔

کارل مارکس کا فکری تضاد

یہ مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال تھی۔ اب غیر مذہبی کلام میں داخلی تضاد کی مثال لیجئے۔ یہاں
اتی کارل مارکس کا حوالہ دوں گا۔ موجودہ زمانہ میں مارکس کی ذہنی عظمت کا حال یہ ہے کہ امریکی پروفیسر
ن گال بریتھ نے مارکس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

If we agree that the Bible is a work of collective authorship, only Mohammad Rivals Marx in the number of professed and devoted followers recruited by a single author. And the competition is not really very close. The followers of Marx now far outnumber the sons of the Prophet.

John Kenneth Galbraith, The Age of Uncertainty British Broadcasting Corporation, 35 Marylebone High Street London, Wim 4 AA, P. 77.

© rasailojaraid.c

اگر ہم یہ مان لیں کہ بائبل کئی اشخاص کی مشترکہ تصنیف ہے تو صرف محمد وہ دوسرے واحد مصنف
ہیں جو معتقدین اور پیروؤں کی تعداد کے اعتبار سے مارکس کی برابری کر سکتے ہیں۔ پھر مقابلہ زیادہ قریب
کا نہیں۔ مارکس کے پیروؤں کی تعداد آج پیغمبر کے پیروؤں کی تعداد سے بہت بڑھ چکی ہے۔
مگر ساری مقبولیت کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ مارکس کا کلام داخلی تضاد کا شاہکار ہے۔
ں کے فکر میں اتنے زیادہ تضادات پائے جاتے ہیں کہ اس کے خیالات کو مجموعہ اضداد کہنا زیادہ
ح ہوگا۔

مثال کے طور پر مارکس نے دنیا کی تمام سماجی خرابیوں کا سبب سماج میں طبقات کا ہونا بتایا
ہے۔ یہ طبقات اس کے نزدیک انفرادی ملکیت کے نظام کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک
ں بند (بورژوا یا سرمایہ دار) ذرائع پیداوار پر قابض ہو کر دوسرے طبقہ کو لوٹتا ہے۔
اس کا حل مارکس نے یہ تجویز کیا کہ سرمایہ دار طبقہ سے اس کی ملکیتیں چھین لی جائیں اور ان کو
دور طبقہ کے زیر انتظام دیدیا جائے۔ اس کارروائی کو وہ بے طبقاتی سماج (Classless Society)
یں کرنے کا نام دیتا ہے مگر یہ کھلی ہوئی تضاد فکری ہے۔ کیونکہ مذکورہ کارروائی سے جو چیز وقوع میں آئے
وہ بے طبقاتی سماج نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ معاشی ذرائع پر ایک طبقہ کا قبضہ ختم ہو کر دوسرے

© rasailojaraid.c

طبقہ کا قبضہ شروع ہو جائے۔ یہ طبقات کا خاتمہ نہیں بلکہ صرف طبقات کی تبدیلی ہے، اس فرق کے ساتھ کہ پہلے یہ قبضہ ملکیت کے نام پر تھا اور اب یہ قبضہ انتظام کے نام پر ہوگا۔ وہ چیز جس کو مارکس بے طبقاتی سماج کہتا ہے وہ عملاً سرمایہ دار طبقہ کی ملکیت کو ختم کر کے کمیونسٹ طبقہ کی ملکیت قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ۔

مارکس ایک ہی چیز کو ایک جگہ برائی کہتا ہے اور دوسری جگہ بھلائی۔ مگر سرمایہ داروں کے خلاف شدید نفرت اور تعصب کی وجہ سے اس کو اپنا یہ فکری تضاد دکھائی نہیں دیا۔ وہ ذرائع معاش کو [illegible]یداروں کے قبضہ میں دے رہا تھا۔ مگر اپنے متعصبانہ اندھے پن کی وجہ سے وہ اپنے اس تضاد کو محسوس نہ کر سکا۔ ایک ہی نوعیت کے دو واقعات میں سے ایک واقعہ کو اس نے انفرادی لوٹ کہا اور دوسرے کو اجتماعی تنظیم۔

قرآن اس قسم کے داخلی تضاد سے مکمل طور پر خالی ہے۔ اس کا کوئی بیان اس کے دوسرے بیان سے نہیں ٹکراتا۔ قرآن کے تمام بیانات میں کامل قسم کی داخلی ہم آہنگی پائی جاتی ہے ۔

غیر متعلق مثال

قرآن کے مخالفین نے اس سلسلہ میں بعض مثالیں دے کر قرآن کے اندر داخلی تضاد ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ مگر یہ تمام کی تمام غیر متعلق مثالیں ہیں۔ گہرا تجزیہ فوراً ان کی غلطی واضح کر دیتا ہے۔

مثال کے طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ قرآن نے ایک طرف یہ اعلیٰ اصول پیش کیا کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو، اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیں (النساء ۱) حدیث (خطبہ حجۃ الوداع) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمام لوگ آدم سے ہیں اور آدم مٹی سے تھے (اَلنَّاسُ مِنْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ) اس اصول کے مطابق عورت کا بھی وہی درجہ ہونا چاہیے جو مرد کا درجہ ہے۔ مگر عملاً ایسا نہیں۔ ایک طرف قرآن مساوات انسانی کا علم بردار ہے اور دوسری طرف اس نے عورت کو سماج میں کم تر مقام دیدیا۔ چنانچہ گواہی کے معاملہ میں یہ قانون مقرر کیا کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی جائیگی۔

یہ سراسر غلط فہمی ہے یہ صحیح ہے کہ اسلام میں عام حالات میں دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے مگر اس کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں ہے ۔ بلکہ اس کی وجہ قطعی طور پر دوسری ہے۔ یہ حکم قرآن کی جس آیت میں ہے وہیں اس کی وجہ بھی بتادی گئی ہے ۔ وہ آیت یہ ہے :

© rasailojaraid.com

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى (البقرہ ۲۸۲)

(جب تم ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو) اور اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔

آیت کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس حکم کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ صرف یادداشت پر ہے۔ آیت اس حیاتیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عورتوں کی یادداشت عام طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے قرض کے معاملہ میں عورت کو گواہی میں لینا ہو تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ تاکہ آئندہ جب کبھی گواہی دینا ہو تو دونوں مل کر ایک دوسرے کی یادداشت کی کمی کی تلافی کر سکیں۔

© rasailojar

یہاں میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی یادداشت کم ہوتی ہے۔ روس میں اس موضوع پر باقاعدہ سائنسی تحقیق کی گئی ہے اور نتائج تحقیق کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس تحقیق کا خلاصہ اخبارات میں آچکا ہے۔ نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یہ خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women, but females are better with words, A Soviet Scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory', Dr. Vladimir Konovalov told the Tass News Agency.

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسداں نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونوولوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔

© rasailojar

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى
(البقرہ ۲۸۲)

(جب تم ادھار کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو) اور اپنے مردوں میں سے دو مرد کو گواہ بنا لو۔ اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں، ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو، تاکہ ان دونوں عورتوں میں سے کوئی اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔

آیت کے الفاظ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس حکم کی بنیاد صنفی امتیاز پر نہیں بلکہ صرف یادداشت پر ہے۔ آیت اس حیاتیاتی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے کہ عورتوں کی یادداشت عام طور پر مردوں سے کم ہوتی ہے۔ اس لیے قرض کے معاملہ میں عورت کو گواہی میں لینا ہو تو ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ تاکہ آئندہ جب کبھی گواہی دینا ہو تو دونوں مل کر ایک دوسرے کی یادداشت کی کمی کی تلافی کر سکیں۔

© rasailojar

یہاں میں یاد دلانا چاہتا ہوں کہ جدید تحقیقات نے اس بات کی تصدیق کر دی ہے کہ مرد کے مقابلہ میں عورت کی یادداشت کم ہوتی ہے۔ روس میں اس موضوع پر باقاعدہ سائنسی تحقیق کی گئی ہے اور نتائج تحقیق کتاب کی صورت میں شائع کیے گئے ہیں۔ اس تحقیق کا خلاصہ اخبارات میں آچکا ہے۔ نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۸ جنوری ۱۹۸۵) میں یہ خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں شائع ہوا ہے:

MEMORISING ABILITY: Men have a greater ability to memorise and process mathematical information than women, but females are better with words, A Soviet Scientist says, reports UPI. 'Men dominate mathematical subjects due to the peculiarities of their memory', Dr. Vladimir Konovalov told the Tass News Agency.

عورتوں کے مقابلہ میں مردوں کے اندر اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔ یہ بات ایک روسی سائنسداں نے کہی۔ ڈاکٹر ولادیمیر کونووالوف نے تاس نیوز ایجنسی کو بتایا کہ مرد ریاضیاتی موضوعات پر چھائے ہوئے ہیں۔ اس کی وجہ ان کے اندر حافظہ کی خصوصی صلاحیت ہے۔

© rasailojar

جب یہ ایک حیاتیاتی واقعہ ہے کہ عورت کی یادداشت فطری طور پر مرد سے کم ہوتی ہے تو یہ عین مطابق حقیقت بات ہے کہ دو عورت کی گواہی ایک مرد کے برابر رکھی جائے۔ قرآن کا یہ قانون قرآن میں تضاد ثابت نہیں کرتا بلکہ یہ ثابت کرتا ہے کہ قرآن ایک ایسی ہستی کی طرف سے آیا ہوا کلام ہے جو تمام حقیقتوں سے باخبر ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن کے احکام میں تمام پہلوؤں کی پوری رعایت پائی جاتی ہے۔

خارجی نامطابقت

اس معاملہ کا دوسرا پہلو خارجی نامطابقت ہے۔ یعنی کسی امر میں کتاب کے اندر جو بات کہی گئی ہے وہ کتاب کے باہر پائی جانے والی حقیقت کے مطابق نہ ہو۔ یہ ایک ایسی کمی ہے جو تمام انسانی تصنیفات میں پائی جاتی ہے۔ انسان اپنی معلومات کے دائرہ میں بولتا ہے۔ اور انسان کی معلومات کا دائرہ چونکہ محدود ہے اس لیے انسانی زبان یا قلم سے ایسی باتیں نکلتی رہتی ہیں جو خارجی صورتِ حال سے مطابقت رکھتی ہوں۔

یہاں ہم چند تقابلی مثالیں بیان کریں گے۔

قانونِ فطرت کی مثال

۱۔ قدیم عرب میں ایک رواج یہ تھا کہ بعض اوقات کوئی شخص اپنی اولاد کو اس اندیشہ سے قتل کر دیتا تھا کہ افرادِ خاندان زیادہ ہو جائیں گے تو ان کے لیے کھانے پینے کا انتظام نہ ہو سکے گا۔ اس سلسلہ میں قرآن میں یہ حکم اترا:

وَلَا تَقْتُلُوٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ۔	اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ
نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ اِنَّ قَتْلَهُمْ	کرو۔ ہم انکو بھی روزی دیں گے اور تم کو بھی۔
كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا (الاسراء ۳۱)	بے شک انکو مار ڈالنا ایک بڑی خطا ہے۔

یہ اعلان گویا ایک قسم کا دعویٰ تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ مستقبل میں آبادی کا کوئی بھی اضافہ زمین پر رزق کی تنگی کا مسئلہ پیدا نہیں کرے گا۔ انسانی تعداد کے مقابلہ میں غذائی اشیاء کا تناسب ہمیشہ موافق طور پر برقرار رہے گا۔ جس طرح آج سب کو ان کی روزی مل رہی ہے اسی طرح آئندہ بھی سب کو ان کی روزی ملتی رہے گی۔

© rasailojaraid.co

مسلمان ہر دور میں اعتقادی طور پر اس اعلان کی صداقت کو مانتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں کبھی بھی وہ ذہن پیدا نہیں ہوا جس کو موجودہ زمانہ میں تحدید نسل یا برتھ کنٹرول کہتے ہیں۔ وہ خُدا کی رزاقی پر بھروسہ کرتے ہوئے رزق کے معاملہ کو خدا پر چھوڑتے رہے ہیں۔ مگر اس اعلان کے ایک ہزار سال بعد انگریز ماہر معاشیات رابرٹ مالتھس (۱۸۳۴-۱۷۶۶) پیدا ہوا۔ ۱۷۹۸ میں "اصول آبادی" پر اس کی مشہور کتاب چھپی جس کا پُورا نام یہ تھا:

An essay on the Principle of Population as it affects the Future Improvement of Society.

مالتھس نے اپنی اس کتاب میں وہ مشہور نظریہ پیش کیا جس کا خلاصہ اس کے الفاظ میں یہ تھا:

Population, when unchecked, increases in a geometrical ratio. Subsistence only increases in an arithmatical ratio.

آبادی، جب کہ وہ بے قید طور پر چھوڑ دی جائے، جیومیٹری کے تناسب سے بڑھتی ہے۔ اشیاء غذا کی صرف ارتھمٹک کے تناسب سے بڑھتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا اضافہ اور غذائی اشیاء کا اضافہ قدرتی طور پر یکساں نہیں ہے۔ انسانی آبادی کا اضافہ ۱-۲-۴-۸-۱۶-۳۲-۶۴ کے تناسب سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس غذائی اشیاء میں اضافہ کا تناسب ۱-۲-۳-۴-۵-۶-۷-۸ رہتا ہے۔ یعنی انسانی آبادی میں اضافہ نہایت تیز رفتار ہوتا ہے اور غذائی اشیاء میں اضافہ نہایت سُست رفتار۔ اس بنا پر مالتھس نے کہا کہ زمین پر انسانی نسل کو بچانے کے لیے ضروری ہے کہ پیدائش پر کنٹرول قائم کیا جائے۔ انسان کی تعداد کو ایک خاص حد سے آگے بڑھنے نہ دیا جائے۔ ورنہ بہت جلد ایسا ہو گا کہ آبادی اور غذائی اشیاء میں غیر متناسب اضافہ کی وجہ سے فاقہ کا دور شروع ہو جائے گا اور بے شمار انسان بُھوک سے مرنے لگیں گے۔

مالتھس کی اس کتاب نے دنیا کی فکر پر زبردست اثر ڈالا۔ اس کی تائید میں بے شمار لکھنے اور بولنے والے پیدا ہو گئے۔ یہاں تک کہ ساری دنیا میں برتھ کنٹرول اور فیملی پلاننگ کی کوششیں شروع ہو گئیں۔ مگر اب محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کا اندازہ سراسر غلط تھا۔ مسٹر گوائن ڈائر (Gwynne Dyer) کا خلاصہ ایک مقالہ کی صورت میں شائع کیا ہے۔ اس مقالہ کا عنوان بامعنی طور پر یہ ہے:

(Malthus: The False Prophet)

© rasailojarar

مقالہ نگار جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں :

It is the 150th anniversary of Malthus's death, and his grim predictions have not yet come true. The world's population has doubled and reboulded in a geometrical progression as he foresaw, only slightly checked by wars and other catastrophes, and now stands at about eight times the total when we wrote. But food production has more than kept pace, and the present generation of humanity is on average the best fed in history.

مالتھس کی موت کو اب ۱۵۰ سال گزر چکے ہیں اور اس کی سنگین پیشین گوئیاں ابھی تک پوری نہیں ہوئیں۔ دنیا کی آبادی جیومیٹری کے حساب سے دگنی اور چوگنا ہو گئی جیسا کہ اس نے کہا تھا، اس میں جنگوں اور حوادث کی وجہ سے بس تھوڑا سا فرق پڑا ہے۔ جب مالتھس نے اپنی کتاب لکھی تھی اس وقت کی آبادی کے مقابلہ میں آج دنیا کی آبادی تقریباً آٹھ گنا ہو چکی ہے۔ مگر غذائی پیداوار بھی کچھ اضافہ ہی کے ساتھ بڑھتی رہی ہے۔ اور انسان کی موجودہ نسل کو اوسط طور پر تاریخ کی سب سے بہتر غذا مل رہی ہے

(ہندوستان ٹائمس ۲۸ دسمبر ۱۹۸۴)۔

رابرٹ مالتھس ”روایتی زراعت“ کے دور میں پیدا ہوا۔ وہ اس کا اندازہ نہ کر سکا کہ جلد ہی ”سائنٹفک زراعت“ کا دور آنے والا ہے جس کے بعد پیداوار میں غیر معمولی اضافہ کرنا ممکن ہو جائے گا۔ پچھلے ڈیڑھ سو سال میں زراعت کے طریقوں میں انقلابی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اب ایسے منتخب بیج بوئے جاتے ہیں جو زیادہ فصل دینے والے ہوں۔ یہی معاملہ مویشیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ کھیتوں کو زرخیز کرنے کے مزید طریقے دریافت ہو گئے ہیں۔ نئی نئی کھادیں بڑے پیمانے پر استعمال ہونے لگی ہیں۔ مشین کی مدد سے ان مقامات پر کھیتی ہونے لگی ہے جہاں پہلے کھیتی کرنا ناممکن نظر آتا تھا۔ آج ترقی یافتہ ملکوں میں کسانوں کی تعداد میں ۹۰ فی صد تک کمی کرنے کے باوجود زرعی پیداوار کو دس گنا تک بڑھا لیا گیا ہے۔ وغیرہ

تیسری دنیا (غیر ترقی یافتہ ممالک) کا جو رقبہ ہے اس کے لحاظ سے اس میں ۳۳ بلین انسانوں کی آباد کاری کی گنجائش ہے جبکہ اس کی موجودہ آبادی صرف ۳ بلین ہے۔ تیسری دنیا امکانی طور پر اپنی موجودہ آبادی کی دس گنا تعداد کو خوراک مہیا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ الف اے او نے اندازہ لگایا ہے کہ تیسری دنیا کے ممالک کی آبادی اگر بے قید طور پر بڑھتی رہے اور ۲۰۰۰ء میں چار بلین سے زیادہ ہو جائے تب بھی کوئی خطرہ کی بات نہیں۔ کیونکہ اندازہ کے مطابق اس وقت جو آبادی

© rasailojaraid.c
© rasailojaraid.c

ہو گی اس سے ڈیڑھ گنا آبادی کو خوراک مہیا کرنے کے ذرائع پھر بھی تیسری دنیا کے علاقہ میں موجود ہوں گے۔

خوراک میں یہ اضافہ جنگلوں کو کاٹے بغیر ممکن ہو سکے گا۔ اس لیے حقیقت یہ ہے کہ نہ تو عالمی سطح پر کسی غذائی بحران کا کوئی حقیقی اندیشہ ہے اور نہ علاقائی سطح پر۔ مسٹر گرائن ڈائر نے اپنی رپورٹ ان الفاظ پر ختم کی ہے :

Malthus was wrong. We are not doomed to breed ourselves into famine.

مالتھس غلطی پر تھا۔ ہمارے لیے یہ مقدر نہیں کہ ہماری اگلی نسلیں قحط میں پیدا ہوں۔

یہ واقعہ ظاہر کرتا ہے کہ مالتھس کی کتاب "اصولِ آبادی" انسانی ذہن کی پیداوار تھی جو زمان و مکان کے اندر محدود تھا جب کہ اس کے برعکس قرآن ایک ایسے ذہن سے نکلا ہوا کلام ہے جو زمان و مکان سے بلند ہو کر سوچنے کی طاقت رکھتا ہے۔ یہی فرق اس بات کا سبب ہے کہ مالتھس کا کام خارجی حقیقت سے ٹکرا گیا اور قرآن آخری حد تک خارجی حقیقتوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

کُتبِ مقدسہ کی مثال

۴۔ بنی اسرائیل حضرت یوسف کے زمانہ میں ۲۰ ویں صدی قبل مسیح میں مصر میں داخل ہوئے۔ اور حضرت موسیٰ کے زمانہ میں تیرھویں صدی قبل مسیح میں مصر سے نکل کر صحرائے سینا میں گئے۔ یہ دونوں واقعات بائبل میں بھی مذکور ہیں اور قرآن میں بھی، مگر قرآن کے بیانات خارجی تاریخ سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ جب کہ بائبل میں کئی ایسی باتیں ہیں جو خارجی تاریخی واقعات سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ چنانچہ بائبل کے معتقدین کے لیے یہ مسئلہ پیدا ہو گیا ہے کہ وہ بائبل کے بیان کو لیں یا تاریخ کے بیان کو۔ کیونکہ دونوں کو بیک وقت لینا ممکن نہیں۔

۱۲ جنوری ۱۹۸۵ کو نئی دہلی کے انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز (تغلق آباد) میں اجتماع تھا۔ اس اجتماع کے مقرر مسٹر عذرا کولٹ (Ezra Kolet) تھے۔ جو ہندوستان میں آباد یہودیوں کی مجلس (Council of Indian Jewry) کے صدر ہیں۔ تقریر کا عنوان تھا :

'What is Judaism'

یہودی مقرر نے اپنی تقریر میں قدرتی طور پر یہودیوں کی تاریخ بیان کی۔ انہوں نے مصر میں ان کے

© rasailojaraid.com

جانے اور پھر وہاں سے نکلنے کا بھی تذکرہ کیا۔ اس سلسلہ میں حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ کا ذکر آیا تو انہوں نے حضرت یوسف کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہا اور حضرت موسیٰ کے ہم عصر مصری بادشاہ کو بھی فرعون بتایا۔

ہر صاحب علم جانتا ہے کہ یہ بات تاریخی اعتبار سے غلط ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ "فرعون" نام کے بادشاہ صرف بعد کو حضرت موسیٰ کے زمانہ میں ہوئے۔ اس سے پہلے حضرت یوسف کے زمانہ میں دوسرے لوگ مصر کے حکمران تھے۔

حضرت یوسف جس زمانہ میں مصر میں داخل ہوئے اس زمانہ میں وہاں ان لوگوں کی حکومت تھی جن کو تاریخ میں چرواہے بادشاہ (Hyksos Kings) کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ عرب نسل سے تعلق رکھتے تھے اور باہر سے آکر مصر پر قابض ہو گئے تھے۔ یہ خاندان دو ہزار سال قبل مسیح سے لیکر پندرھویں صدی قبل مسیح کے آغاز تک مصر پر حکمراں رہے۔ اس کے بعد مصر میں غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف بغاوت ہوئی اور ہکسوس کی حکومت ختم کر دی گئی۔

اس کے بعد مصر میں ملک والوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس وقت جس خاندان کو مصر کی بادشاہی ملی اس نے اپنے حکمرانوں کے لیے فرعون کا لقب پسند کیا۔ فرعون کے لفظی معنی سورج دیوتا کی اولاد کے ہیں۔ اس زمانہ میں مصر کے لوگ سورج کو پوجتے تھے۔ چنانچہ حکمرانوں نے یہ ظاہر کیا کہ وہ سورج دیوتا کا مظہر ہیں تاکہ مصریوں کے اوپر اپنا حق حکومت ثابت کیا جا سکے۔

مسٹر عذرا کولٹ نے جو کچھ کیا وہ مجبور تھے کہ ویسا ہی کریں۔ کیونکہ بائبل میں ایسا ہی لکھا ہوا ہے۔ بائبل حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کو بھی فرعون کہتی ہے۔ مسٹر عذرا کولٹ یا تو بائبل کو لے سکتے تھے یا تاریخ کو۔ دونوں کو ساتھ لینا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے یہودی کونسل کا صدر ہونے کی حیثیت سے تاریخ کو چھوڑا اور بائبل کو اختیار کر لیا۔

مگر قرآن اس قسم کے اختلاف بیانی سے خالی ہے۔ اس لیے حاملین قرآن کے لیے یہ مسئلہ نہیں کہ قرآن کو لینے کے لیے انہیں تاریخی حقیقت کو چھوڑنا پڑے۔ قرآن کے زمانہ نزول میں یہ تاریخی واقعات لوگوں کو معلوم نہ تھے۔ یہ تاریخ ابھی تک قدیم آثار کی صورت میں زمین کے نیچے دفن تھی جن کو بہت بعد کو زمین کی کھدائی سے برآمد کیا گیا۔ اور ان کی بنیاد پر مصر کی

© rasailojaraid.co
© rasailojaraid.co

تاریخ مرتب کی گئی۔

اس کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں حضرت یوسف کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو قرآن اس کے لیے مَلِکِ مصر (مصر کا بادشاہ) کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اور حضرت موسیٰ کے ہم زمانہ مصری بادشاہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اس کو بار بار فرعون کہتا ہے۔ اس طرح قرآن کا بیان خارجی تاریخی حقیقت کے عین مطابق ٹھہرتا ہے۔ جبکہ بائبل کا بیان خارجی تاریخی حقیقت سے ٹکرا رہا ہے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جو انسانی معلومات کے ماوراء تمام حقیقتوں کو براہِ راست دیکھ رہا ہے۔

تاریخ کی مثال

© rasailojaraid.com

نظریہ ارتقاء کے مطابق انسان اور حیوان دونوں ایک مشترک مورث اعلیٰ سے تعلق رکھتے ہیں۔ حیوانات کی ایک نسل ترقی کرتے کرتے بندر (چمپینزی) تک پہنچی۔ اور بندر کی یہ نسل مزید ترقی کرتے کرتے انسان بن گئی۔

اس سلسلہ میں ایک سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو حیوان اور انسان کی درمیانی کڑیاں کہاں ہیں۔ یعنی وہ انواع کون سی ہیں جو ابھی ارتقاء کے درمیانی سفر میں تھیں اور اس بنا پر ان کے اندر کچھ حیوانی پہلو تھے اور کچھ انسانی پہلو۔ اگرچہ حقیقی طور پر ابھی ایسی کوئی درمیانی نوع دریافت نہیں ہوئی ہے، تاہم علماء ارتقاء کو یقین ہے کہ ایسی انواع گزری ہیں۔ البتہ ان کا سراغ انھیں ابھی تک نہیں ملا ہے، ان مفروضہ کڑیوں کو غلط طور پر گم شدہ کڑیوں (Missing Links) کا نام دیا گیا ہے۔

۱۹۱۲ میں لندن کے اخبارات نے پرجوش طور پر یہ خبر دی کہ بندر اور انسان کے درمیان کی ایک گم شدہ کڑی دریافت ہوگئی ہے۔ یہ وہی کڑی ہے جس کو ارتقاء کی تاریخ میں پلٹ ڈاؤن انسان (Piltdown Man) کہا جاتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ تھی کہ لندن کے برٹش میوزیم کو قدیم زمانہ کا ایک جبڑا ملا جس کا ڈھانچہ بندر جیسا تھا مگر اس کا دانت انسان کے دانت سے مشابہ تھا۔ اس ہڈی کے ٹکڑے کی بنیاد پر ایک پوری تصویر بنائی گئی جو دیکھنے والوں کو بندر نما انسان یا انسان نما بندر دکھائی دیتی تھی۔ اس کو پلٹ ڈاؤن انسان کا نام دیا گیا۔ کیونکہ وہ پلٹ ڈاؤن نامی مقام سے

© rasailojaraid.com

حاصل ہوا تھا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کو تیزی سے مقبولیت حاصل ہوئی۔ وہ باقاعدہ طور پر نصاب کی کتابوں میں شامل کر لیا گیا۔ مثال کے طور پر آر ایس لل (R. S. Lull) کی کتاب عضویاتی ارتقاء (Organic Evolution) میں۔ بڑے بڑے علماء و مفکرین نے اس کو جدید انسان کی علمی فتوحات میں شمار کیا۔ مثلاً ایچ جی ویلس (۱۸۶۶ - ۱۹۴۶) نے اپنی کتاب تاریخ کا خاکہ (The Outline of History) میں۔ اور برٹرینڈ رسل (۱۸۷۲ - ۱۹۷۰) نے اپنی کتاب مغربی فلسفہ کی تاریخ (A History of Western Philosophy) میں۔ تاریخ اور حیاتیات کی کتابوں میں پلٹ ڈاؤن انسان کا ذکر اس طرح کیا جانے لگا جیسے کہ وہ ایک مسلمہ حقیقت ہو۔

تقریباً نصف صدی تک جدید علماء اس "عظیم دریافت" سے مسحور رہے۔ یہاں تک کہ ۱۹۵۳ میں بعض علماء کو شبہہ ہوا۔ انہوں نے برٹش میوزیم کے آہنی فائر پروف بکس سے مذکورہ جبڑا نکالا۔ اس کو سائنسی طریقہ سے جانچا۔ تمام متعلق پہلوؤں سے اس کی تحقیق کی۔ آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ مکمل طور پر ایک فریب تھا جس کو حقیقت سمجھ لیا گیا۔

پلٹ ڈاؤن انسان کی اصل حقیقت یہ تھی کہ ایک شخص نے بندر کا ایک جبڑا لیا۔ اس کو مہوگنی رنگ میں رنگا اور پھر اس کے دانت کو ریتی سے گھس کر آدمی کے دانت کی طرح بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے یہ جبڑا یہ کہہ کر برٹش میوزیم کے حوالے کر دیا کہ یہ اس کو پلٹ ڈاؤن (انگلینڈ) میں ملا ہے۔

یہ ایک بڑی دلچسپ کہانی ہے۔ اس کی تفصیل کے لیے چند حوالے یہاں نقل کیے جاتے ہیں:

1. Encylopaedia Britanica (1984) "Piltdown Man"
2. Bulletin of the British Museum (Natural History) Vol. 2, No. 3 and 6
3. J.S. Weiner, The Piltdown Forgery (1955)
4. Ronald Millar, The Piltdown Men (1972).
5. Readers Digest November 1956.

فرعونِ موسیٰ

اس کے مقابلہ میں اب قرآن سے اسی نوعیت کی ایک مثال لیجئے۔ یہ فرعونِ موسیٰ کی مثال ہے۔ اس کے بارہ میں قرآن میں جو الفاظ آئے تھے، بعد کی تاریخ حیرت انگیز طور پر اس کی تصدیق بن گئی۔

© rasailojaraid.c

تاریخ کے مطابق حضرت موسیٰ کے زمانہ میں مصر کا جو بادشاہ غرق ہوا وہ رعمسیس دوم کا فرزند تھا۔ اس کا خاندانی لقب فرعون اور ذاتی نام مرنفتاح (MERNAPATAH) تھا۔ نزول قرآن کے وقت اسی فرعون کا ذکر صرف بائبل کے مخطوطات میں تھا۔ اس میں بھی صرف یہ لکھا تھا کہ " خداوند نے سمندر کے بیچ ہی میں مصریوں کو تہ و بالا کر دیا اور فرعون کے سارے لشکر کو سمندر میں غرق کر دیا (خروج ۱۴ : ۲۸) اس وقت قرآن نے حیرت انگیز طور پر یہ اعلان کیا کہ فرعون کا جسم محفوظ ہے اور وہ دنیا والوں کے لیے سبق بنے گا:

فَالْيَوْمَ نُنَجِّيْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰيَةً۔

آج ہم تیرے بدن کو بچا لیں گے تاکہ تو اپنے بعد والوں کے لیے نشانی ہو۔

(یونس : ۹۲)

قرآن میں یہ آیت اترنا خود نہایت عجیب تھی۔ اس وقت کسی کو بھی یہ معلوم نہ تھا کہ فرعون کا جسم کہیں محفوظ حالت میں موجود ہے۔ اس آیت کے نزول پر اسی حالت میں تقریباً چودہ سو سال گزر گئے۔ پروفیسر لاریٹ (Loret) پہلا شخص ہے جس نے ۱۸۹۸ میں مصر کے ایک قدیم مقبرہ میں داخل ہو کر دریافت کیا کہ یہاں مذکورہ فرعون کی لاش ممی کی ہوئی موجود ہے۔ ۸ جولائی ۱۹۰۷ کو ایلیٹ اسمتھ (Elliot Smith) نے اس لاش کے اوپر لپٹی ہوئی چادر کو ہٹایا۔ اس نے اس کی باقاعدہ سائنسی تحقیق کی اور پھر ۱۹۱۲ میں ایک کتاب شائع کی جس کا نام ہے شاہی ممیاں (The Royal Mummies) اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ یہ ممی کی ہوئی لاش اسی فرعون کی ہے جو تین ہزار سال پہلے حضرت موسیٰؑ کے زمانہ میں غرق کیا گیا تھا۔ ایک مغربی مفکر کے الفاظ میں:

"His earthly remains were saved by the Will of God from destruction to become a sign to man, as it is written in the Qur'an."

فرعون کا مادی جسم خدا کی مرضی کے تحت بربادی ہونے سے بچا لیا گیا تاکہ وہ انسان کے لیے ایک نشانی ہو، جیسا کہ وہ قرآن میں لکھا ہوا ہے۔

قرآن اور بائبل اور سائنس (The Bible, The Quran, and Science) کے مصنف ڈاکٹر موریس بوکیل (Maurice Bucaille) نے ۱۹۷۵ میں فرعون کی اسی لاش کا معائنہ کیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی کتاب میں اس پر جو باب لکھا ہے اس کا خاتمہ ان پُراثر سطروں پر ہوا ہے:

© rasailojaraid

Those who seek among modern data for proof of the veracity of the Holy Scriptures will find a magnificent illustration of the verses of the Qur'an dealing with the Pharoah's body by visiting the Royal Mummies Room of the Egyptian Museum, Cairo!

وہ لوگ جو مقدس کتابوں کی سچائی کے لیے جدید ثبوت چاہتے ہیں وہ قاہرہ کے مصری میوزیم میں شاہی ممیوں کے کمرہ کو دیکھیں، وہاں وہ قرآن کی ان آیتوں کی شاندار تصدیق پالیں گے جو کہ فرعون کے جسم سے بحث کرتی ہیں۔

قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں کہا کہ فرعون کا جسم لوگوں کی نشانی کے لیے محفوظ ہے، اور وہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں نہایت صحت کے ساتھ برآمد ہوگیا۔ دوسری طرف موجودہ زمانہ کے علماء سائنس نے اعلان کیا کہ پلٹ ڈاؤن کے مقام پر انہوں نے ایک ڈھانچہ دریافت کیا ہے جو قدیم انسان کے جسم کا ایک حصہ ہے۔ اور اگلی معلومات کے تحت وہ بالکل بے بنیاد ثابت ہوگیا۔

کیا اس کے بعد بھی اس میں کوئی شبہہ باقی رہتا ہے کہ قرآن ایک خدائی کتاب ہے۔ وہ عام انسانی تصنیفات کی طرح کوئی انسانی تصنیف نہیں۔

© rasailojaraid.c

علم الحیات کی مثال

قدیم زمانہ میں جب کہ موجودہ سائنسی مشاہدات سامنے نہیں آئے تھے، ساری دنیا میں توہماتی خیالات پھیلے ہوئے تھے۔ لوگوں نے بلا تحقیق عجیب عجیب نظریات قائم کر لیے تھے۔ یہ نظریات دوبارہ وقت کی کتابوں میں ظاہر ہوتے تھے۔ جو شخص بھی اس زمانہ میں کوئی کتاب لکھتا تو ماحول کے زیر اثر وہ ان خیالات کو بھی دہرانے لگتا تھا۔

مثال کے طور پر ارسطو (۳۲۲–۳۸۴ ق م) نے ایک موقع پر پیٹ میں پرورش پانے والے بچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ وقت کے رواجی فکر کے مطابق یہ کہتا ہے کہ پیٹ کے بچوں کی صحت کا تعلق ہواؤں سے ہے۔ ارسطو کے اس خیال کا مذاق اڑاتے ہوئے برٹرنڈ رسل نے لکھا ہے:

He said that children will be healthier if conceived when the wind is in the north. One gathers that the two Mrs Aristotles both had to run out and look at the weathercock every evening before going to bed. (P. 17).

© rasailojaraid.c

ارسطو نے کہا کہ بچے زیادہ تندرست ہوں گے اگر شمالی رخ پر ہوا چلنے کے وقت ان کا حمل قرار پائے۔ ایک شخص اس سے قیاس کر سکتا ہے کہ ارسطو کی دونوں بیویاں ہر شام کو بستر پر جانے سے پہلے دوڑ کر باہر جاتی ہوں گی اور دیکھتی ہوں گی کہ ہوا کا رخ کس سمت میں ہے

قرآن اسی قدیم زمانہ میں اترا۔ اس میں علم کی مختلف شاخوں سے متعلق کثرت سے حوالے موجود ہیں۔ مگر قرآن میں کوئی ایک بھی مثال نہیں ملتی جس میں وقت کے رواجی خیالات کا انعکاس پایا جاتا ہو۔

اجسام فلکی کی گردش

قرآن (الانبیاء ۳۳، یٰسین ۴۰) میں سورج اور چاند کا ذکر کر کے ارشاد ہوا ہے کہ سب ایک ایک دائرہ میں تیر رہے ہیں (كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ) ڈاکٹر موریس بوکیل نے ان آیات پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور دکھایا ہے کہ یہاں فلک سے وہی چیز مراد ہے جس کو موجودہ زمانہ میں مدار (Orbit) کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> It is shown that the sun moves in an orbit, but no indication is given as to what this orbit might be in relation to the Earth. At the time of the Qur'anic Revelation, it was thought that the Sun moved while the Earth stood still. This was the system of geocentrism that had held away since the time of Ptolemy, second century B.C., and was to continue to do so until Copernicus in the sixteenth century A.D. Although people supported this concept at the time of Muhammad, it does not appear anywhere in the Qur'an, either here or elsewhere. (P. 159).

مذکورہ آیات میں یہ دکھایا گیا ہے کہ سورج ایک مدار میں گھومتا ہے۔ مگر اس بات کا کوئی اشارہ نہیں دیا گیا ہے کہ زمین کی نسبت سے اس کا مدار کیا ہے۔ قرآن کے نزول کے زمانہ میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ سورج (زمین کے گرد) گھوم رہا ہے، جب کہ زمین ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ مرکزیت ارضی کا نظام تھا جو دوسری صدی قبل مسیح میں ٹالمی کے زمانہ سے چھایا ہوا تھا۔ وہ سولھویں صدی عیسوی میں کوپرنیکس تک باقی رہا۔ اگرچہ محمدؐ کے زمانہ میں لوگ اس نظریہ کی تائید کرتے تھے مگر قرآن میں وہ کہیں ظاہر نہیں ہوا۔ نہ ان دونوں آیتوں میں اور

© rasailojaraid.com

نہ کسی اور آیت میں۔

جنینی ارتقاء

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ مثال وہ ہے جو ۱۹۸۴ کے آخر میں مختلف اخبارات میں شائع ہوئی تھی۔ کناڈا کے اخبار دی سٹی زن (۲۲ نومبر ۱۹۸۴) نے اس کی سرخی ان الفاظ میں قائم کی:

Ancient Holy Book 1300 Years Ahead of its time.

(قدیم مقدس کتاب اپنے وقت سے ۱۳ سو سال آگے) اسی طرح نئی دہلی کے اخبار ٹائمس آف انڈیا (۱۰ دسمبر ۱۹۸۴) میں یہ خبر حسب ذیل سرخی کے ساتھ چھپی:

Kor'an Scores over Modern Science

قرآن جدید سائنس پر بازی لے جاتا ہے۔

ڈاکٹر کیتھ مور جنینیات کے ماہر ہیں اور کناڈا کی ٹورانٹو یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ انہوں نے قرآن کی چند آیات (المؤمنون ۱۴، الزمر ۶) اور جدید تحقیقات کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ کئی بار کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی (جدہ) بھی گئے۔ انہوں نے پایا کہ قرآن کا بیان حیرت انگیز طور پر جدید دریافتوں کے عین مطابق ہے۔ یہ دیکھ کر انہیں سخت تعجب ہوا کہ قرآن میں کیوں کر وہ حقیقتیں موجود ہیں جو مغربی دنیا نے پہلی بار صرف ۱۹۴۰ میں معلوم کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مقالہ لکھا ہے جس میں وہ مذکورہ واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

The 1300 years old Koran contains passages so accurate about embryonic development that Moslems can reasonably believe them to be revelations from God.

۱۳ سو سالہ قدیم قرآن میں جنینی ارتقاء کے بارہ میں اس قدر درست بیانات موجود ہیں کہ مسلمان معقول طور پر یہ یقین کر سکتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے اتاری ہوئی آیتیں ہیں۔

(یہ مضمون زیادہ مفصل طور پر ماہنامہ الرسالہ میں شائع کیا جا رہا ہے)

نیوٹن کا نظریہ نور

انسان جب بھی کسی مسئلہ پر کلام کرتا ہے تو فوراً ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ "حال" میں بول رہا ہے۔ اسے

© rasailojaraid.com

مستقبل کی کوئی خبر نہیں۔ کوئی انسان آئندہ ظاہر ہونے والی حقیقتوں کو نہیں جانتا اس لیے وہ اپنے کلام میں ان کی رعایت بھی نہیں کرسکتا۔ یہ ایسا معیار ہے جس پر آدمی ہمیشہ ناکام ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس قرآن کو دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر ماضی سے مستقبل تک یکساں طور پر پھیلی ہوئی ہے۔ وہ آج کے معلوم واقعات کو بھی جانتا ہے اور ان واقعات کو بھی جو کل انسان کے علم میں آئیں گے۔

مثال کے طور پر نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) نے روشنی کے بارہ میں یہ نظریہ قائم کیا کہ یہ چھوٹے چھوٹے روشن ذرات میں جو اپنے منبع سے نکل کر فضا میں اڑتے ہیں۔ اس نظریہ کو سائنس کی تاریخ میں روشنی کا ذراتی نظریہ (Corpuscular theory of light) کہا جاتا ہے۔

A theory of Optics, in which light is treated as a stream of particles.

نیوٹن کے غیر معمولی اثرات کے تحت یہ نظریہ ۱۸۲۰ تک علمی دنیا پر چھایا رہا۔ اس کے بعد اس کو زوال شروع ہوا۔ مختلف سائنس دانوں کی تحقیقات، خاص طور پر فوٹان (Photons) کے عمل کی دریافت نے روشنی کے ذراتی نظریہ کو ختم کر دیا۔ پروفیسر ینگ (اور دوسرے سائنس دانوں) کی تحقیق نے علما کو مطمئن کر دیا کہ روشنی بنیادی طور پر موج کی سی خصوصیات رکھتی ہے جو بظاہر نیوٹن کے ذراتی نظریہ کے برعکس ہے:

Young's work convinced scientists that light has essential wave characteristics in apparent contradiction to Newton's corpuscular (particle) theory.

Encyclopaedia Britanica, 1984, Vol. 19, P. 665.

نیوٹن نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں اپنا نظریہ پیش کیا اور صرف دو سو سال کے اندر وہ غلط ثابت ہوگیا۔ اس کے برعکس قرآن نے ساتویں صدی عیسوی میں اپنا پیغام دنیا کے سامنے رکھا۔ اور چودہ سو سال گزرنے کے باوجود اس کی صداقت آج تک مشتبہ نہیں ہوئی۔ کیا اس کے بعد بھی اس یقین کے لیے کسی مزید ثبوت کی ضرورت ہے کہ نیوٹن جیسے لوگوں کا کلام محدود انسانی کلام ہوتا ہے اور قرآن لامحدود ذہن سے نکلا ہوا خدائی کلام ہے۔ قرآن کے بیانات کا ابدی طور پر درست ثابت ہونا ایک انتہائی غیر معمولی صفت ہے جو کسی بھی دوسرے کلام کو حاصل نہیں۔ یہی واقعہ یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ قرآن خدائی کلام ہے اور بقیہ تمام کلام انسانی کلام۔

© rasailojaraid.com

کائنات کا آغاز

قرآن میں ارشاد ہوا ہے: کیا منکروں نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین ملے ہوئے تھے پھر ہم نے دونوں کو کھول دیا (اَوَلَمْ یَرَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ کَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا (الانبیاء: ۳۰)

"رتق" کے معنی ہیں منضم الاجزاء۔ یعنی کسی چیز کے تمام اجزاء کا ایک دوسرے میں گھسا ہوا اور سمٹا ہوا ہونا۔ اور فتق کا لفظ اس کے برعکس عمل کے لیے ہے۔ یعنی ملے ہوئے اجزاء کو پھاڑ کر الگ الگ کر دینا۔

یہ آیت ساتویں صدی عیسوی میں اتری۔ بظاہر اس سے معلوم ہوتا تھا کہ کائنات کے مختلف اجزا ابتداءً باہم ملے ہوئے اور سمٹے ہوئے تھے۔ اس کے بعد خدا نے ان کو پھاڑ کر جدا کر دیا۔ تاہم نزولِ قرآن کے بعد صدیوں تک انسان کو معلوم نہ تھا کہ کائنات میں وہ کون سا معاملہ پیش آیا ہے جس کو قرآن نے رتق اور فتق سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی بار اس کی معنویت ۱۹۲۷ میں سامنے آئی جب کہ جارج لیماتر (Georges Lemaitre) نے وہ نظریہ پیش کیا جس کو عام طور پر بگ بینگ (Big bang) کہا جاتا ہے۔

جدید مشاہدہ بتاتا ہے کہ کائنات ہر لمحہ اپنے چاروں طرف پھیل رہی ہے۔ چنانچہ موجودہ کائنات کو پھیلتی ہوئی کائنات (Expanding Universe) کہا جاتا ہے۔ اس طرح کے مختلف مشاہدات نے سائنس دانوں کو اس نظریہ تک پہنچایا ہے کہ کائنات ابتداءً سمٹی ہوئی حالت میں تھی۔ اس وقت پوری کائنات کے تمام اجزاء نہایت قوت سے باہم جڑے ہوئے تھے۔ اس ابتدائی مادہ کو کائناتی بیضہ (Cosmic egg) یا سپر ایٹم (Super atom) کہا جاتا ہے۔

ابتداءً سائنسی حلقہ میں اس کی مخالفت کی گئی۔ ۱۹۴۸ تک بگ بینگ کے مقابلہ میں استقراری اسٹیڈی اسٹیٹ نظریہ (Steady-state hypothesis) سائنسدانوں کے یہاں زیادہ قابلِ توجہ بنا رہا۔ مگر ۱۹۵۰ سے علم کا وزن بگ بینگ کے حق میں بڑھنے لگا۔ ۱۹۶۵ میں بیک گراؤنڈ ریڈیشن (Background radiation) کی دریافت نے اس کی مزید تصدیق کی۔ کیونکہ سائنس دانوں کا خیال ہے کہ یہ ابتدائی انفجار کے ریڈیائی بقایا ہیں جو ابھی تک کائنات کے بعض حصوں میں موجود ہیں۔ اسی طرح ۱۹۸۱ میں بعض کہکشاؤں کی دریافت جو ہماری زمین سے دس ارب سال نور (Light years)

© rasailojaraid.c

کے فاصلہ پر واقع ہیں۔ وغیرہ۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (۱۹۸۴) میں بگ بینگ کے عنوان کے تحت اعتراف کیا گیا ہے کہ اور اب اس نظریہ کو بیشتر علماء کونیات کی تائید حاصل ہے:

and it is now favoured by most cosmologists.

یہ واقعہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ قرآن کا مصنف ایک ایسی ہستی ہے جس کی نظر میں ماضی سے لیکر مستقبل تک کے تمام حقائق ہیں۔ وہ چیزوں کو وہاں سے دیکھ رہا ہے جہاں سے انسان نہیں دیکھ سکتا۔ وہ اس وقت بھی پوری طرح جان رہا ہوتا ہے جب کہ دوسروں کو کوئی علم نہیں ہوتا۔

شہد کی طبی اہمیت

قرآن میں شہد کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اس کے اندر شفا ہے (فِيهِ شِفَاءٌ لِلنَّاسِ، النحل ۶۹) مسلمانوں نے اس آیت کی روشنی میں شہد کے طبی پہلو پر بہت زور دیا۔ مسلمانوں کے یہاں دواسازی کے فن میں شہد کو خصوصی درجہ حاصل رہا ہے۔ مگر مغربی دنیا صدیوں تک اس کی طبی اہمیت سے بے خبر رہی۔ یورپ میں ابھی انیسویں صدی تک شہد کو بس ایک رقیق غذا (Liquid food) کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ صرف بیسویں صدی کی بات ہے کہ یورپ کے علماء نے یہ دریافت کیا کہ شہد کے اندر دافع عفونت خصوصیات (Antiseptic properties) موجود ہیں۔

اس سلسلہ میں جدید تحقیقات کا خلاصہ ہم ایک امریکی میگزین سے نقل کرتے ہیں:

Honey is powerful destroyer of germs which produce human diseases. It was not until the twentieth century, however, that this was demonstrated scientifically. Dr. W. G. Sackett, formerly with the Colorado Agricultural College at Fort Collins, attempted to prove that honey was a carrier of disease much like milk. To his surprise, all the disease germs he introduced into pure honey were quickly destroyed. The germ that causes Typhoid fever died in pure honey after 48 hours' exposure. Enteritidis, causing intestinal inflation, lived 48 hours. A hardy germ which causes bron-chopheumonia and septicemia held out for four days. Bacillus coli Communis which under certain conditions

© rasailojaraid.c

causes peritonitis, was dead on the fifth day of experiment. According to Dr. Bodog Beck, there are many other germs equally destructible in honey. The reason for this bactericidal quality in honey, he said, is in its hygroscopic ability. It literally draws every particle of moisture out of germs. Germs, like any other living organism, perish without water. This power to absorb moisture is almost unlimited. Honey will draw moisture from metal, glass, and even stone crocks.

Rosicrucian Digest, September 1975, P. 11
The Rosicrucian Supply Bureau,
Rosicrucian Park, San Joes, California 95191, U.S.A.

شہد جراثیم کو مار ڈالنے والی چیز ہے جو کہ انسانی بیماریاں پیدا کرتے ہیں، تاہم بیسویں صدی سے پہلے تک اس کو عملی طور پر دکھلایا نہیں جا سکا تھا۔ ڈاکٹر ساکٹ جو اس سے پہلے فورٹ کولنس کے ایگریکلچرل کالج سے وابستہ تھے، انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ شہد کے اندر بیماری کے جراثیم پرورش پاتے ہیں۔ مگر ان کو سخت تعجب ہوا جب تجربات کے دوران انہوں نے پایا کہ بیماری پیدا کرنے والے جراثیم جو انہوں نے خالص شہد کے اندر ڈالے تھے وہ سب کے سب بہت جلد مر گئے۔ میعادی بخار کے جراثیم صرف ۴۸ گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گئے۔ بعض سخت جان جراثیم بھی چار دن یا پانچ دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ ڈاکٹر بوڈوگ بک نے بتایا ہے کہ شہد کے اندر جراثیم کو مارنے کی اس خصوصیت کی سادہ سی وجہ ہے۔ وہ شہد کی رطوبت کو چوس لینے کی صلاحیت ہے۔ شہد جراثیم کی رطوبت کا ہر جز کھینچ لیتی ہے۔ جراثیم دوسرے حیوانات کی طرح پانی کے بغیر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ شہد کے اندر پانی کو جذب کرنے کی صلاحیت لامحدود مقدار میں ہے۔ وہ دھات، شیشہ اور پتھر تک سے رطوبت کھینچ لیتی ہے۔

قرآن کی برتری

عربی زبان تمام زبانوں کے درمیان ایک حیران کن استثناء ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پانچ سو سال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لیے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر جافرے چاسر (۱۴۰۰ - ۱۳۴۲) اور ولیم شیکسپیر (۱۶۱۶ - ۱۵۶۴) انگریزی زبان کے شاعر

© rasailojaraid.c

اور ادیب تھے۔ مگر آج کا ایک عام انگریزی داں ان کو پڑھنا چاہے تو اس کو انہیں ترجمہ کر کے پڑھنا پڑے گا۔ چاسر اور شیکسپیر کا کلام جدید انگریزی نصاب میں ترجمہ کر کے پڑھایا جاتا ہے، ویسے ہی جیسے غیر زبان کی کتابیں ترجمہ کر کے پڑھائی جاتی ہیں۔

مگر عربی زبان کا معاملہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے۔ عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی ہے۔ اس کے الفاظ اور اسلوب میں یقیناً ارتقاء ہوا ہے۔ مگر یہ ارتقاء اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنی کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا جس طرح چھٹی اور ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن کا معجزہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے تاکہ جس طرح قرآن کو قیامت تک باقی رہنا ہے اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت میں قیامت تک باقی رہے۔ یہ کتاب بھی "کلاسیکل لٹریچر" کی الماری میں نہ جانے پائے۔ وہ ہمیشہ لوگوں کے درمیان پڑھی اور سمجھی جاتی رہے۔

یہی معاملہ علوم کا بھی ہے۔ یہاں بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے علوم کو پکڑ رکھا ہے۔ وہ علوم کو پکڑ کر بیٹھ گیا ہے تاکہ قرآن نے کسی معاملہ میں جو کچھ کہہ دیا ہے وہی ہمیشہ حرف آخر کی حیثیت سے باقی رہے۔ چنانچہ بے شمار علمی ترقیوں کے باوجود علوم بالآخر وہیں باقی رہتے ہیں یا وہیں لوٹ آتے ہیں جہاں قرآن نے اول دن ان کو رکھ دیا تھا۔

ایک طرف انسانی کلام کی مثال ہے کہ وہ چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔ جب کہ قرآن انتہائی بڑے اور گہرے معاملات میں بھی اپنی برتر صداقت کو قائم کیے ہوئے ہے۔ یہاں میں ایک تقابلی مثال دوں گا۔

ارسطو نے اپنے تصوراتی معاشرہ میں عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔ اس کا ثبوت اس کے نزدیک یہ ہے کہ عورت کے منہ میں مرد سے کم دانت ہوتے ہیں۔ برٹرنڈ رسل نے اس کا مذاق اڑایا ہے اس نے اپنی کتاب سماج پر سائنس کے اثرات (The Impact of Science on Society) میں ارسطو کا مذاق اڑاتے ہوئے لکھا ہے:

Aristotle maintained that women have fewer teeth than men;

© rasailojaraid.
© rasailojaraid.

although he was twice married, it never occurred to him to verify this statement by examining his wives' mouths. (P. 17)

ارسطو نے دعویٰ کیا کہ عورتوں کے یہاں مردوں سے کم دانت ہوتے ہیں۔ اگرچہ ارسطو کی دوبار شادی ہوئی تھی مگر ایسا کبھی نہیں ہوا کہ وہ اپنی بیویوں کے مُنہ کو جانچ کر اس بیان کی تصدیق کرتا۔

ارسطو کا بیان حقیقت واقعہ پر حاوی نہ ہو سکا۔ اس کے برعکس قرآن کے بیانات حقیقت واقعہ کا اس طرح احاطہ کیے ہوئے ہیں کہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے خلاف نہیں جاتے۔

یہاں میں ایک مثال دوں گا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ خدا اس کائنات کا حاکم مطلق ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرح چاہتا ہے اسے چلاتا ہے (فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ، يَفْعَلُ اللهُ مَا يَشَاءُ) پچھلے ہزاروں سال سے خدا کا یہ تصور تسلیم شدہ چلا آ رہا تھا۔ انسان اس کو بلابحث مانے ہوئے تھا۔

مگر موجودہ زمانہ میں علم کی ترقی ہوئی تو انسان نے یہ نظریہ قائم کر لیا کہ واقعات کے پیچھے معلوم مادی اسباب کے سوا اور کوئی قوت نہیں۔ تمام واقعات مادی اسباب وعلل کے تحت وقوع میں آتے ہیں۔ اور مادی قوانین کے تحت ان کی کامل توجیہہ کی جا سکتی ہے۔ مگر بعد کی علمی تحقیقات نے اس مفروضہ کو ڈھا دیا۔ اب علم دوبارہ وہیں آگیا جہاں ابتداء میں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔

اصُولِ تعلیل کی موت

کہا جاتا ہے کہ نیوٹن (۱۷۲۷-۱۶۴۲) اپنے باغ میں تھا۔ اس نے سیب کے ایک درخت سے سیب کا پھل گرتے ہوئے دیکھا۔ "سیب کا پھل شاخ سے الگ ہو کر نیچے کیوں گرا اور اوپر کیوں نہیں چلا گیا"۔ اُس نے سوچا۔ اس سوال نے آخر کار اس کو یہاں تک پہنچایا کہ زمین میں قوت کشش ہے۔ وہ ہر چیز کو اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پھل درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے، وہ اُوپر کی طرف نہیں جاتا۔

مگر یہ آدھی حقیقت تھی۔ نیوٹن کو سوچنا چاہیئے تھا کہ درخت کا پھل اگر اوپر سے نیچے گرتا ہے تو اسی درخت کا تنہ نیچے سے اوپر کی طرف کیوں جاتا ہے۔ ایک ہی درخت ہے۔ اس کی جڑیں

© rasailojaraid.

© rasailojaraid.

زمین کے نیچے کی طرف جارہی ہیں۔ اس کا پھل ٹوٹتا ہے تو وہ گر کر نیچے آجاتا ہے۔ مگر اسی درخت کا تنہ اور اس کی شاخیں زمین سے اٹھ کر اوپر کی طرف چلی جارہی ہیں۔

درخت کا یہ دوگونہ پہلو نیوٹن کے مفروضہ کی نفی کر رہا تھا۔ تاہم اس نے معاملہ کے ایک پہلو کو چھوڑ کر اس کے دوسرے پہلو کو لے لیا۔ پھر اسی کی روشنی میں اس نے خلا میں پھیلے ہوئے شمسی نظام کے اصول مرتب کیے۔ وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ تمام اجرام میں ایک خاص تناسب سے قوت کشش سورج اور اس کے گرد گھومنے والے سیاروں کو سنبھالے ہوئے ہے اور اس کو نہایت صحت کے ساتھ متحرک رکھتی ہے۔

یہ طرز فکر مزید آگے بڑھا۔ یہاں تک کہ آئن سٹائن (۱۸۷۹-۱۹۵۵) نے اپنے نظریہ اضافیت کے تحت اس کو مزید موکد کیا۔ آئن سٹائن کی تحقیق اگرچہ نیوٹن کے تمام نظریات کی تصدیق نہیں کرتی۔ تاہم نظام شمسی کے سلسلے میں اس کے نظریہ کی بنیاد کشش ثقل کے اصول پر ہی قائم ہے:

> Eistein's theory of relativity declares that gravity controls the behaviour of Planets, stars, galaxies and the universe itself and does it in a predictable manner.

© rasailojaraid.c

آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت کہتا ہے کہ کشش ثقل سیاروں، ستاروں، کہکشاؤں اور خود کائنات کے عمل کو کنٹرول کرتی ہے۔ یہ عمل اس طرح ہوتا ہے کہ اس کی پیشین گوئی کی جاسکتی ہے۔

اس سائنسی دریافت کو ہیوم (۱۷۱۱-۱۷۷۶) اور دوسرے منکرین نے فلسفہ بنایا۔ انہوں نے کہا کہ کائنات کا سارا نظام اصول تعلیل (Principle of causation) پر چل رہا ہے۔ جب تک اسباب وعلل کی کڑیاں معلوم نہیں تھیں انسان یہ سمجھ رہا کہ کائنات کو کنٹرول کرنے والا ایک خدا ہے۔ مگر اب ہم کو اسباب وعلل کے قوانین کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ تعلیل (Causation) کا مادی اصول کائنات کو متحرک کرنے والا ہے نہ کہ کوئی مفروضہ خدا۔

مگر بعد کی تحقیقات نے اس مفروضہ کا خاتمہ کر دیا۔ بعد کو ڈیراک، ہیزن برگ اور دوسرے سائنس دانوں نے ایٹم کے ڈھانچہ کا مطالعہ کیا۔ انہوں نے پایا کہ ایٹم کا نظام اس اصول کی تردید کر رہا ہے جو شمسی نظام کے مطالعہ کی بنیاد پر اختیار کیا گیا تھا۔

اس دوسرے نظریہ کو کوانٹم نظریہ کہا جاتا ہے اور وہ مذکورہ اصول تعلیل کی کامل تردید ہے:

© rasailojaraid.c

The quantum mechanics theory maintains that, at the atomic level, matter behaves randomly.

کوانٹم میکینکس کا نظریہ کہتا ہے کہ ایٹم کی سطح پر مادہ غیر مرتب انداز میں عمل کرتا ہے۔

سائنس میں کسی "اصول" کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ سارے عالم میں یکساں طور پر کام کرتا ہو۔ اگر ایک معاملہ بھی ایسا ہو جس پر وہ اصول چسپاں نہ ہوتا ہو تو علمی طور پر اس کا مسلّمہ اصول ہونا مشتبہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جب یہ معلوم ہوا کہ ایٹم کی سطح پر مادہ اس طرح عمل نہیں کرتا جس کا مشاہدہ نظام شمسی کی سطح پر کیا گیا تھا تو تعلیل بحیثیت سائنسی اصول کے رد ہو گیا۔

آئن سٹائن کو یہ بات ناقابل فہم معلوم ہوئی۔ کیونکہ اس طرح کائنات مادی کرشمہ کے بجائے ارادی کرشمہ قرار پا رہی تھی۔ اس نے اس مسئلہ پر باقاعدہ تحقیق شروع کی۔ اپنی زندگی کے آخری ۳۰ سال اس نے اس کوشش میں صرف کر دیے کہ نظام فطرت میں اس "تضاد" کو ختم کرے۔ شمسی نظام اور ایٹمی نظام دونوں کو ایک قانون کے تحت منظم کر سکے۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوا۔ یہاں تک کہ بالآخر ناکام مر گیا:

© rasailojaraid.

Einstein spent the last 30 years of his life trying to reconcile these seeming contradictions of nature. He rejected the randomness of quantum mechanics. "I cannot believe that God plays dice with the cosmos," he said.

آئن سٹائن نے اپنی آخری زندگی کے ۳۰ سال اس پر صرف کیے کہ فطرت کے اس بظاہر متضاد اصول کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کرے۔ اس نے کوانٹم نظریہ کی بے ترتیبی کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ میں یقین نہیں کر سکتا کہ خدا کائنات کے ساتھ جوا کھیل رہا ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا بیان کائنات کو پکڑے ہوئے ہے۔ شمسی نظام کی سطح پر حرکت کا مطالعہ کر کے انسان نے اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یہ رائے قائم کر لی کہ اس کی حرکت معلوم مادی اسباب کے تحت ہو رہی ہے۔ یہ با اختیار خدا کے قرآنی تصور کی گویا تردید تھی۔ مگر علم کا دریا جب آگے بڑھا تو دوبارہ قرآن والی بات غالب آگئی۔ بیسویں صدی میں ایٹمی نظام کے مطالعہ نے بتایا کہ ایٹم کی سطح پر اس کے ذرات کی حرکت کا کوئی معلوم قاعدہ نہیں۔

ایک سائنسدان اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتا ہے:

The laws of physics discovered on earth contain arbitrary

© rasailojaraid.